درس ۲۶

اُمت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآنِ حکیم کی جامع ترین سورت
اُمُّ المُسَبِّحات : سورۃ الحدید
(۶)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہ الکریم ..... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَاَنۡفَقُوۡا لَہُمۡ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ۞ وَمَا لَکُمۡ لَا تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ ۚ وَالرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ لِتُؤۡمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ وَقَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۞ ہُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ بِکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ۞ وَمَا لَکُمۡ اَلَّا تُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلِلّٰہِ مِیۡرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ لَا یَسۡتَوِیۡ مِنۡکُمۡ مَّنۡ اَنۡفَقَ مِنۡ قَبۡلِ الۡفَتۡحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیۡنَ اَنۡفَقُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَقٰتَلُوۡا ؕ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الۡحُسۡنٰی ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ۞ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗۤ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ ۞﴾ ..... (آیات ۷ تا ۱۱)

گزشتہ نشست کا قرض

سورۃ الحدید کی ان پانچ آیات پر اس سورۂ مبارکہ کا دوسرا حصہ مشتمل ہے۔ اس سے قبل کہ میں ان آیات کا ترجمہ اور ان کے بارے میں کچھ وضاحت پیش کروں'

گزشتہ نشست کا جو قرض باقی رہ گیا تھا وہ ادا کر رہا ہوں۔ شیخ ابن عربی کے بارے میں مَیں عرض کر چکا ہوں کہ جہاں تک حقیقت و ماہیتِ وجود کے بارے میں ان کی رائے کا تعلق ہے' میں اس سے متفق ہوں اور میرا مسلک بھی وہی ہے۔ البتہ اور بہت سی باتیں' خواہ انہوں نے لکھیں یا ان کی طرف غلط منسوب کر دی گئیں' ان سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا میں نہ تو ان کے بارے میں جواب دہ ہوں' نہ ان کی وضاحت میرے ذمہ ہے اور نہ ہی مجھے ان کے وکیل کی حیثیت حاصل ہے۔ خود اس فلسفہ وجود کے بارے میں بھی مَیں عرض کر چکا ہوں کہ اس کا تعلق نہ شریعت سے ہے نہ طریقت سے۔ اس فلسفہ کو جس کا جی چاہے قبول کرے اور جو اسے ردّ کرنا چاہے ردّ کر دے۔ اس کے نہ ماننے سے کسی اعتبار سے بھی دین میں کوئی کمی یا نقص واقع نہیں ہوتا۔ البتہ تنقید اور اختلاف کے معاملے میں دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جس شخص کے نظریات پر آپ تنقید کر رہے ہیں پہلے اس کے اصل مسلک کو ضرور سمجھ لیں۔ شیخ ابن عربی کے فلسفہ وجود پر اکثر وبیشتر ناقدین' بالخصوص آج کل کے سلفی المزاج لوگ' جس انداز کی تنقیدیں کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو ان لوگوں نے اس مسئلہ کو سمجھا ہی نہیں' اور دوسرے یہ کہ جو باتیں شیخ ابن عربی نے کہی ہی نہیں وہ بھی ان سے منسوب کر دیتے ہیں۔ بہر حال اس مسئلے کو میں نے اپنے طور پر جس طرح حل کیا ہے وہ میں بیان کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت تو ہمارے لئے مطلوب و مقصود ہے اور اسی پر ہمارے طرزِ عمل اور دینی رویئے کی ساری بنیاد ہے۔ معرفتِ ربّ جس قدر گہری ہو گی اسی قدر ہمارے عمل میں گہرائی ہو گی' معرفت میں جتنی زیادہ وسعت ہو گی ہمارے دینی رویئے اور دینی روش میں بھی اتنی ہی زیادہ وسعت ہو گی۔ گویا معرفتِ ربّ اور ہمارا دینی رویہ ایک دوسرے کے ساتھ راست متناسب (proportionate) ہوں گے —— میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دو حصے ہیں: (۱) ذاتِ باری تعالیٰ' اور (۲) صفاتِ باری تعالیٰ —— ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں مَیں نے آپ کو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دو مقولوں پر مشتمل ایک شعر سنایا تھا:

الـعِجـزُ عـن دَرکِ الـذّاتِ اِدراکٌ
والبَحـثُ عـن کُنـہِ الذّاتِ اِشراکٌ

یعنی جب انسان کواللہ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہونے کا احساس ہو جائے تو بس یہی ادراک ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کی کنہ میں کھود کرید کرو گے تو شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ گویا معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!

شیخ سعدیؒ نے اس بات کو خوب بیان کیا ہے ؎

توان در بلاغت بہ سُحباں رسید
نہ در کنہِ بے چونِ سبحاں رسید!

سُحباں ایک بہت ہی حکیم شخصیت کا نام ہے جو فصاحت و بلاغت کی معراج پر فائز تھے۔ شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ بلاغت و فصاحت اور خطابت میں تو انسان سحباں تک بھی پہنچ سکتا ہے' لیکن ذاتِ باری تعالیٰ سبحانہٗ کی کُنہ تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دوسرا حصہ صفات پر مشتمل ہے۔ معرفت ربّ کے بارے میں مَیں اپنی حدود و قیود (limitations) عرض کر چکا ہوں کہ ہماری ساری معرفت صفات کے حوالے سے ہے۔ ''ایمانِ مجمل'' کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ

''میں ایمان لایا اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور صفات سے ظاہر ہے''۔

لیکن صفات میں بھی ہم نہ اُن کی کمیت کا ادراک کر سکتے ہیں اور نہ کیفیت کا۔

صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں ہمارے ہاں علم کلام کا یہ مسئلہ متکلمین کے مابین ہمیشہ زیر بحث رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کا عین ہیں یا غیر؟ علامہ اقبال نے بھی اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس مسئلے کی نشاندہی کی ہے ؎

ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات؟
اُمت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ذات و صفات میں کیا نسبت ہے؟ ہمارے لئے تو صفت اضافی

شے ہے۔ ایک وقت تھا کہ مجھے کچھ بھی علم حاصل نہیں تھا۔ آج مجھے تھوڑا یا زیادہ کچھ نہ کچھ علم حاصل ہے' اور ہوسکتا ہے کہ میں ارزل العمر تک پہنچ جاؤں اور وہ علم بالکل زائل ہو جائے (اعاذنا اللہ من ذٰلک) گویا کہ صفتِ علم ہمارے وجود پر ایک اضافی شے ہے' وہ ہمارے وجود کا حصہ نہیں ہے۔ لیکن کیا ہم اللہ کے بارے میں یہ تصور کر سکتے ہیں؟ اس مسئلہ پر بڑی طویل بحثیں ہوئی ہیں۔ میری یہ خوش قسمتی ہے کہ مجھے مولانا منتخب الحق صاحب سے استفادہ کا موقع ملا جو اِس دَور میں فلسفہ ومنطق کے قدیم مکتب فکر ''خیر آباد اسکول آف تھاٹ'' کی آخری شخصیت تھے۔ جب میں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا تھا تو وہاں میں نے مولانا منتخب الحق صاحب سے استفادہ کیا اور یہ مسئلہ میری سمجھ میں آیا۔ میں یہاں وہ مسئلہ تو بیان نہیں کر رہا' لیکن اس کا سب کے نزدیک جو متفق علیہ حل ہے وہ ہے ''لا عینٌ ولا غیرٌ'' یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات نہ اس کی ذات کا عین ہیں اور نہ غیر۔ سمجھ میں آئے تب بھی یہ ماننا پڑتا ہے نہ آئے تب بھی ماننا پڑتا ہے' اس لئے کہ اگر عین مانیں گے تب بھی بہت سی ایسی چیزیں لازم آ جائیں گی جنہیں تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور اگر غیر مانیں گے تب بھی ایسی بہت سی چیزیں لازم آ جائیں گی جن کا اللہ کے بارے میں گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ''لا عینٌ ولا غیرٌ'' کی ایک تعبیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ''من وجہٍ عینٌ ومن وجہٍ آخر غیرٌ'' یعنی ایک اعتبار سے وہ غیر ہیں اور ایک اعتبار سے عین۔ یہ گویا دوسرا مقدمہ ہوا۔

اب آیئے تیسری بات کی طرف! ہر شخص جانتا ہے کہ یہ سلسلۂ کون ومکان اللہ تعالیٰ کے ایک امر ''کُن'' کا ظہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں دو مقامات (الکہف: ۱۰۹ ولقمان: ۲۷) پر آیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے کلمات کو گن نہیں سکتے۔ اگر کل روئے ارضی کے درخت قلم اور سارے سمندر سیاہی بن جائیں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے' لیکن سیاہی ختم ہو جائے گی۔ اگر سیاہی کی اتنی ہی مقدار مزید لائی جائے تو وہ بھی اس مقصد کے لئے ناکافی ہوگی۔ ﴿لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّىْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات اللہ کے کسی نہ کسی کلمۂ

کن کا ظہور ہیں۔ اب سمجھئے کہ ''کُن'' کیا ہے؟ کلام ہے' کلمہ ہے۔ اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ گویا کہ حرفِ ''کُن'' اللہ کی صفت ہے اور صفت کے بارے میں متکلمین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ''لا عینٌ ولا غیر''۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ یہ کائنات نہ اللہ کا عین ہے اور نہ غیر ہے' اور یہی بات ہے جو شیخ ابنِ عربی کہہ رہے ہیں:

من وجہٍ عینٌ ومن وجہٍ آخر غیرٌ

ایک اعتبار سے یہ عین ہیں اور ایک اعتبار سے غیر ہیں۔ ماہیت وجود (essential being) میں اتحاد ہے' لیکن جہاں بھی تعین ہوگا اور مختلف چیزوں کا definite وجود مان لیا جائے گا تو وہ اللہ کا غیر ہے۔ یہی مسلک ابنِ عربی کا ہے اور یہی اس مسئلے میں میری توجیہہ ہے۔

اس سلسلہ میں آخری بات یہ عرض کر رہا ہوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ بہت سے حضرات کا شاید یہ ذوق نہ ہو' اس کے باوجود میں یہ مسئلہ اس لئے بیان کر دیا کرتا ہوں کہ ان بزرگوں اور اسلاف کے بارے میں سوئے ظن نہ رہے جو وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ اس سے ہمیں اپنے آپ کو بچالینا چاہئے' کیونکہ یہ بہت بڑی محرومی ہے۔ کسی بھی شخص سے اختلاف کا حق ہر شخص کو حاصل ہے' یہاں تک کہ آراء کی حد تک ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی اختلاف کر سکتے ہیں۔ کوئی شخص یہ رائے رکھ سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فلاں معاملہ میں یوں نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک عصمت خاصۂ نبوت ہے اور نبوت کے خاتمہ کے ساتھ عصمت ختم ہو چکی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد اب کوئی بھی معصوم نہیں ہے۔

آیاتِ زیرِ درس کا رواں ترجمہ و مفہوم

اب آیئے اس سورۂ مبارکہ کے دوسرے حصے کی طرف' جو اس کے عملی پہلو پر مشتمل ہے! میں چاہتا ہوں کہ پہلے ان پانچ آیات کا ایک رواں ترجمہ سامنے آجائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے پہلی ہی آیت بڑی عظمت کی حامل ہے اور ان

پانچوں کو ایک کل کی حیثیت سے سامنے رکھیں گے تو نظر آئے گا کہ جہاں ایک طرف فصاحت و بلاغت کی معراج ہے وہیں جامعیت اور اس کے ساتھ ترتیب اور توازن کی بھی انتہا ہے جو آپ کو ان پانچ آیات میں ملے گی۔ پہلی آیت کا رواں ترجمہ یوں ہوگا:

''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر (یا ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر) اور خرچ کر دو (لگا دو' کھپا دو) ان سب چیزوں میں سے جس میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔ تو جو لوگ تم میں سے (دین متین کے یہ دو تقاضے پورے کر دیں۔ یعنی) ایمان لے آئیں اور انفاق کا حق ادا کر دیں تو ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے''۔

ایک آیت میں جامعیت کے ساتھ دین کے جملہ تقاضوں کو دو الفاظ میں بیان کر دیا گیا۔ حسن ترتیب اور حسن توازن ملاحظہ کیجئے کہ اب ان میں سے ہر ایک تقاضے پر دو دو آیات آ رہی ہیں' ایک ایک آیت میں ذرا سرزنش' ڈانٹ ڈپٹ' زجر اور ملامت کا انداز ہے اور ایک ایک آیت میں ترغیب اور تشویق ہے۔ فرمایا:

''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے درانحالیکہ رسول تمہیں دعوت دے رہا ہے کہ اپنے ربّ پر ایمان رکھو اور وہ تم سے قول و قرار لے چکا ہے اگر تم واقعی مؤمن ہو''۔

اس آیت میں گویا کہ زجر و ملامت اور ایک طرح کی تنبیہہ اور سرزنش ہے۔ اس کے بعد اگلی آیت میں تشویق و ترغیب آئی ہے کہ اگر تمہیں اپنے باطن میں جھانکنا نصیب ہو جائے' اپنے دلوں کو ٹٹولنے کی سعادت حاصل ہو جائے اور محسوس ہو کہ واقعتاً خانۂ دل ایمان سے خالی ہے تو بھی گھبراؤ نہیں۔ فرمایا:

''وہی ہے (اللہ) جو نازل فرما رہا ہے اپنے بندے پر روشن آیات' تاکہ وہ تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے' اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے''۔

اندھیرے شرک کے ہیں' کفر و الحاد کے ہیں' مادیت کے ہیں' حرص و ہوا کی غلامی کے ہیں۔

کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ ہستم اسیرِ کمندِ ہوا!

یہ مختلف shades of darkness ہیں۔ قرآن مجید میں ''ظُلُمات'' ہمیشہ جمع کے صیغہ میں اور نور ہمیشہ واحد آیا ہے۔ نور کے اندر تعدّد بھی لایا گیا ہے تو بھی واحد کے صیغے میں: ﴿نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ﴾ جبکہ اندھیروں کا تذکرہ بایں الفاظ فرمایا: ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾۔ تو اللہ نے یہ کتاب اتاری ہے' اس کی یہ آیاتِ بینات ہیں جو تمہیں ہر طرح کے اندھیروں سے نکال کر تمام ظلمات سے' ہر طرح کے shades of darkness سے روشنی میں لے آئیں گی۔ یقیناً اللہ تعالیٰ رؤف و رحیم ہے۔ وہ تم پر بہت مہربان ہے' وہ تمہارا خیر خواہ ہے' تم پر رحم فرمانے والا ہے۔

تو یہ دو آیات ہو گئیں۔ اب اگلی دو آیات میں بھی یہی انداز ہے۔ ان میں سے پہلی آیت میں وہی سرزنش کا اسلوب ہے۔ فرمایا:

> ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (تم پر یہ بخل کیوں طاری ہو گیا؟ تم نے یہ سینت سینت کر رکھنے کی روش کیوں اختیار کر لی؟) حالانکہ آسمان و زمین کی وراثت تو اللہ ہی کے لئے ہے۔ (تم سب دنیا سے چلے جاؤ گے اور یہ سب کچھ اللہ ہی کے لئے رہ جائے گا۔) برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے پہلے انفاق اور قتال کیا تھا۔ ان کے درجات بہت بلند ہیں اُن کے مقابلے میں جنہوں نے فتح کے بعد انفاق اور قتال کیا' اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے''۔

فعل وہی ہے ''اِنفاق'' یعنی جان و مال کا کھپانا' لیکن جن حالات میں کوئی شخص کر رہا ہے اس اعتبار سے اس کی قدر و قیمت میں زمین و آسمان کا فرق و تفاوت واقع ہو جائے گا۔ جب دین غربت کی حالت میں ہے' پامال ہے' دین کا کوئی ساتھی نہیں' دین کا کوئی جاننے والا نہیں' ازروئے حدیث نبویؐ: ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْباً وَسَیَعُوْدُ غَرِیْباً کَمَا بَدَأَ' فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) (صحیح مسلم' کتاب الایمان) ''دین کی ابتداء حالت اجنبیت میں ہوئی اور عنقریب یہ دوبارہ ویسے ہی اجنبی ہو جائے گا جیسے ابتداء میں تھا۔ پس خوش خبری ہے ان اجنبیوں کے لئے''۔ تو اس حالت غربت میں جنہوں نے اسلام

کا ساتھ دیا ان السّـابقون الاوّلون کا اللہ کے ہاں جو مرتبہ ہے اس تک وہ لوگ ہرگز نہیں پہنچ سکتے جو اسلام کو غلبہ حاصل ہونے کے بعد آئے اور قتال و انفاق کیا۔ اگر وہ حسن نیت سے آئے ہیں تو اُن کے اجر و ثواب کی بھی اللہ کی طرف سے ضمانت دی گئی ہے' لیکن درجے میں وہ اُن کے برابر کبھی نہیں ہو سکتے جنہوں نے حالتِ غربت میں اور حالتِ ضعف میں دین کا ساتھ دیا۔ ان سب سے اللہ کا بہت اچھا وعدہ ہے۔ جنت سب کو ملے گی' جو پہلے آئے ان کو بھی اور جو بعد میں آئے ان کو بھی' البتہ حسن نیت شرط ہے۔ پھر جنت کے درجات میں بھی بہت فرق و تفاوت ہوگا۔ حدیث میں آیا ہے کہ نچلے درجے والا جنتی اوپر کے درجے والے جنتی کو ایسے دیکھے گا جیسے تم زمین سے آسمان پر ستاروں کو دیکھتے ہو۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ اس سے پہلے آیت ۴ میں الفاظ آئے تھے: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۞﴾ جبکہ یہاں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۞﴾ ''بصیر'' اور ''خبیر'' دونوں الفاظ اردو میں مستعمل ہیں۔ قرآن مجید میں ترتیب کے لحاظ سے ''بصیر'' کو مقدم اور ''خبیر'' کو مؤخر کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ خبر اصل شے ہے' بصارت میں دھوکہ کھانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ وہ خبیر ہے' یعنی وہ تمہارے باطن سے بھی باخبر ہے' تمہاری نیتوں کو بھی جانتا ہے۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں:

((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى اَجْسَادِكُمْ وَلَا اِلٰى صُوَرِكُمْ ' وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ)) (متفق علیه)

''اللہ تعالیٰ نہ تمہارے تن و توش کو دیکھتا ہے اور نہ تمہاری صورتوں کو' بلکہ وہ تو تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے''۔

آیت ۱۰ ذرا طویل آیت تھی جس میں سرزنش کا انداز تھا' اب اگلی آیت میں جو ترغیب کا انداز ہے واقعہ یہ ہے کہ غالب کے اس شعر کے بالکل مصداق ہے کہ ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد!

''کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دینے کی ہمت کرے؟ پھر وہ اس کو اس کے لئے بڑھاتا رہے گا اور اس کے لئے بہترین اجر ہے''۔

دنیا میں تمہارا قرضِ حسنہ کا تصور یہ ہے کہ صرف اصل زر واپس آئے گا' مزید کچھ نہیں ملے گا' لیکن تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو گے تو وہ اس کو بڑھاتا رہے گا اور انفاق کرنے والے کو اصل مال تو بڑھ کر دوگنا' چوگنا' سوگنا' بلکہ سات سوگنا تک ملے گا ہی' بہترین اجر وثواب اضافی طور پر اس کے علاوہ ہوگا۔

یہ پانچ آیات ہیں جن پر اس سورۂ مبارکہ کا حصہ دوم مشتمل ہے' جس میں دین کے عملی تقاضوں کو نہایت فصاحت' بلاغت' خطابت اور غایت درجہ جامعیت اور حسنِ ترتیب اور حسنِ توازن کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان آیات میں جو ترتیب اور توازن موجود ہے واقعہ یہ ہے کہ میرے علم کی حد تک اس کی کوئی دوسری نظیر قرآن مجید میں نہیں ملتی۔

دعوتِ ایمان کے مخاطب کون؟

اب ہم ان آیات کا ذرا تفصیل سے مطالعہ کرتے ہیں۔ پہلی آیت میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خطاب کس سے ہو رہا ہے؟

﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝﴾

''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور خرچ کرو اُس میں سے جس میں اس نے تمہیں خلافت عطا کی ہے۔ پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور انفاق کریں ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے''۔

اگر صرف اس آیت کے الفاظ کو سامنے رکھا جائے تو امکان موجود ہے کہ یہ خطاب غیر مسلموں' یہود و نصاریٰ وغیرہ سے ہو' لیکن سیاق و سباق سے اور پوری پانچ آیات کے مطالعہ سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ یہاں اُن سے خطاب نہیں ہے' بلکہ یہ خطاب مسلمانوں سے ہے۔ ان سُورتوں کا مجموعی تعارف کراتے ہوئے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ ان سورتوں میں کفار و مشرکین' یہود و نصاریٰ وغیرہ سے خطاب ہے ہی نہیں' بلکہ روئے سخن کلیتہً مسلمانوں سے ہے۔

اب دوسرا سوال اٹھتا ہے کہ مسلمانوں میں سے کون لوگ اس کے مخاطب ہیں؟ وہ لوگ کہ جن کی حرارتِ ایمانی میں کچھ کمی ہے' معیارِ مطلوب پر نہیں ہے' جن کا جذبۂ انفاق جتنا ہونا چاہئے اتنا نہیں ہے' جن کا جوشِ جہاد اور ذوقِ شہادت جتنا ہونا چاہئے اتنا نہیں ہے' جن میں ضعف ہے اور ایمان اور اعمالِ صالحہ کا جو درجہ مطلوب ہے اس پر پورے نہیں اترتے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن سے یہ خطاب کیا جا رہا ہے۔ اسی لئے ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کے دو ترجمے ہوں گے: ایک یہ کہ ''ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر'' اور دوسرا یہ کہ ''ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر''۔ پہلے ترجمے میں یہ امکان موجود ہے کہ گویا کفار و مشرکین سے خطاب ہو رہا ہے' جبکہ دوسرے ترجمہ میں خطاب گویا مسلمانوں سے ہے۔ میرے نزدیک درحقیقت یہاں خطاب ان کمزور اور ضعیف مسلمانوں سے ہے جن کے اندر حرارتِ ایمانی' جذبۂ جہاد اور جوشِ انفاق جتنا ہونا چاہئے نہیں ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم میں اس آیت کی ہم مضمون آیاتؐ کون سی ہیں۔ سب سے پہلے سورۃ النساء کی یہ آیت ملاحظہ کیجئے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ﴾ (آیت ۱۳۶)

''اے اہلِ ایمان! ایمان لاؤ (یا ایمان رکھو) اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر بھی جو اس نے اس سے پہلے نازل فرمائی تھی۔''

یعنی اے اہلِ ایمان! ایمان کا حق ادا کرو...... اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو! ویسے مانو جیسے ماننے کا حق ہے...... اے ایمان کے دعوے دارو! ایمان لاؤ اور ایمان پختہ رکھو اللہ اور اس کے رسولؐ پر...... الخ

سورۃ الصّف ہمارے منتخب نصاب کے حصہ چہارم کا مرکزی درس ہے۔ اس کی آیات ۱۰'۱۱ میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۞ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۞﴾

''اے اہل ایمان! کیا تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے؟ (وہ یہ ہے کہ) ایمان رکھو (یا ایمان لاؤ) اللہ اور اس کے رسولؐ پر' اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔''

گویا کہ مخاطب بھی وہ ہیں جن کو ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کہا گیا اور انہیں حکم بھی ایمان لانے کا دیا جا رہا ہے۔

اس ضمن میں تیسرا مقام سورۃ الحجرات (آیات ۱۴'۱۵) کا ہے' جہاں یہ مضمون بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے منتخب نصاب کے حصہ سوم کی آخری سورت ہے۔ فرمایا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

''یہ بدو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے (ہم مسلمان ہو گئے' ہم نے اطاعت قبول کر لی) جبکہ ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

اور وہ حقیقی ایمان جسے اللہ کے ہاں تسلیم کیا جائے گا' وہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت اگلی آیت میں آ گئی۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۞﴾ (آیت ۱۵)

''حقیقی مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اس کے رسول پر' پھر ہرگز شک میں نہیں پڑے (انہیں یقین کی کیفیت حاصل ہو گئی) اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی ہیں جو (اپنے

دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

یہاں درحقیقت ایمانِ حقیقی کے دو اجزاء بیان کئے گئے ہیں: ایک یقین قلبی اور دوسرا عمل میں جہاد اپنے جان و مال کے ساتھ۔ اس یقین کے بارے میں علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں' یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

تو یہاں (سورۃ الحدید میں) درحقیقت اسی ایمانِ حقیقی کا ذکر ہے: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ یعنی ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر جیسا کہ ایمان کا حق ہے۔

''اِنفاق'' کا جامع مفہوم

اس کے بعد دین کا دوسرا تقاضا ان الفاظ میں بیان کر دیا گیا: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ﴾ ''اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر اُس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے''۔ اس آیت میں چونکہ بہت مختصر الفاظ میں بات آ رہی ہے لہٰذا انفاق کے ساتھ ''فی سبیل اللہ'' مذکور نہیں' بلکہ مقدر (understood) ہے۔ اصل انفاق جو مقصود ہے وہ فی سبیل اللہ ہی ہے۔ اسے اگلی آیت میں کھول دیا گیا: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟'' انفاق سے عام طور پر مال کا خرچ کرنا مراد لیا جاتا ہے' حالانکہ یہ لفظ وسیع المفہوم ہے۔ اس کی بحث سورۃ المنافقون میں ہو چکی ہے کہ نَفَقَ ۔ یَنْفُقُ جب ثلاثی مجرد سے آتا ہے تو اس کے معانی کسی چیز کے ختم ہو جانے' کھپ جانے اور صرف ہو جانے کے ہوتے ہیں۔ اور یہ جاندار اور بے جان سب کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں کہ نَفَقَتِ الدَّرَاهِمُ (درہم ختم ہو گئے) اور نَفَقَ الْفَرَسُ (گھوڑا مر گیا)۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی جس حدیث میں آنحضور ﷺ نے جہاد کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کسی شخص کے اعمالِ صالحہ کے پلڑے میں کسی شے کا وزن اس گھوڑے یا سواری سے بڑھ کر نہیں ہو گا جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے کام آ گئی'

وہاں بھی لفظ ''نُفِقَ'' آیا ہے۔ گویا یہ لفظ بے جان اور جاندار دونوں کے لئے آتا ہے چنانچہ یہاں انفاقِ مال اور انفاقِ نفس دونوں مراد ہیں۔ انفاقِ نفس یہ ہے کہ آپ اپنی صلاحیت وقوت' محنت اور وقت صرف کر رہے ہیں۔ ایک انفاقِ مال ہے' کہ اللہ کے دیئے ہوئے وسائل آپ اس کی راہ میں خرچ کر رہے ہیں۔ لیکن دونوں پر اس لفظ ''انفاق'' کا اطلاق ہوگا۔ انفاقِ جان کی بلند ترین منزل قتال ہے جب انسان اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے۔ جو جنگ میں جاتا ہے موت کا خطرہ مول لے کر جاتا ہے۔ اگر لوٹ آئے تو گویا اسے ایک نئی زندگی ملی ہے' ورنہ جنگ میں جانے والا تو دراصل اپنی جان کی بازی لگانے کا فیصلہ کر کے گیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں انفاق اور قتال دونوں لفظ آ گئے: ﴿لَا یَسۡتَوِیۡ مِنۡکُمۡ مَّنۡ اَنۡفَقَ مِنۡ قَبۡلِ الۡفَتۡحِ وَقٰتَلَ ؕ﴾ ''برابر نہیں ہیں تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے قبل انفاق کیا اور قتال کیا''۔ یہاں ''انفاق'' مال خرچ کرنے کے لئے اور ''قتال'' بذلِ نفس کے لئے آیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لئے جو عہد نامہ معین کیا ہے اس میں ''وَاُنۡفِقَ مَالِیۡ وَاَبۡذُلَ نَفۡسِیۡ'' کے الفاظ شامل کئے ہیں۔ اس عہد نامہ کے پہلے حصے میں تو کلمۂ شہادت اور استغفار ہے۔ دوسرے حصے میں جو عہد ہے وہ بھی تنظیم سے نہیں ہے' نہ مجھ سے کوئی معاہدہ ہے' بلکہ اللہ سے ایک عہد ہے' اس لئے کہ یہ بیع وشراء تو اللہ اور بندے کے درمیان ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَہُمۡ وَاَمۡوَالَہُمۡ بِاَنَّ لَہُمُ الۡجَنَّۃَ ﴾ ''اللہ نے خرید لئے ہیں اہل ایمان سے اُن کے مال بھی اور اُن کی جانیں بھی جنت کے عوض۔'' چنانچہ تنظیم کے ''عہد نامۂ رفاقت'' کا دوسرا حصہ یہ ہے:

> اِنِّیۡ اُعَاھِدُ اللّٰہَ عَلٰی اَنۡ اَھۡجُرَ کُلَّ مَا یَکۡرَھُہٗ وَاُجَاھِدَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ جُھۡدَ اسۡتِطَاعَتِیۡ ' وَاُنۡفِقَ مَالِیۡ وَاَبۡذُلَ نَفۡسِیۡ لِاِقَامَۃِ دِیۡنِہٖ وَاِعۡلَاءِ کَلِمَتِہٖ

''میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ ہر اُس چیز کو چھوڑ دوں گا جو اسے ناپسند ہے' اور

اپنی استطاعت کی حد تک اس کی راہ میں جہاد کروں گا' اور اپنا مال بھی خرچ کروں گا اور اپنی جان بھی کھپاؤں گا اس کے دین کو قائم کرنے کے لئے اور اس کے کلمہ کی سربلندی کے لئے''۔

اس کے بعد یہ الفاظ آتے ہیں:

وَلِاَجْلِ ذٰلِکَ اُبَایِعُ ......

''اس مقصد کی خاطر میں بیعت کر رہا ہوں......''

اس مقصد کے لئے تنظیم میں شمولیت ہو رہی ہے' ورنہ یہ عہد معاہدہ' یہ قول و قرار' یہ میثاق اور یہ بیع و شراء تو ہر بندۂ مؤمن کا' اگر وہ حقیقتاً مؤمن ہے' اللہ کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اگر نہیں ہے تو یہ ہماری محرومی ہے۔

انفاق کتنا کیا جائے؟

اب اس آیت میں تیسری بات نوٹ کیجئے کہ ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ﴾ میں لفظ ''مِمَّا'' مِنْ اور مَا سے بنا ہے' اور مِنْ یہاں تبعیضیہ ہے۔ اللہ کا یہ مطالبہ نہیں ہے کہ اپنا سارا مال لگا دو۔ اللہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ اپنے جسم اور جان کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں ہماری راہ میں لگا دو' بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جن جن چیزوں میں ہم نے تمہیں استخلاف عطا کیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں لگاؤ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ''کتنا؟'' اس کا جواب سورۃ البقرۃ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَیَسْئَلُوْنَکَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ ۵ قُلِ الْعَفْوَ ۵﴾ ''(اے نبیؐ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجئے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو''۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ بندۂ مؤمن اگر اس تقاضے کو واقعتاً کما حقہٗ ادا کرنا چاہتا ہے تو اس ضمن میں وہ کیا طرزِ عمل اختیار کرے! پہلے اپنی نیتوں کو صاف کیجئے' خالص کیجئے کہ جو بات سامنے آئے گی اس پر اگر دل گواہی دے گا کہ واقعتاً صحیح ہے تو قبول کریں گے۔ میرے نزدیک یہاں مِنْ تبعیضیہ اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ بندۂ مؤمن اپنے جان اور مال' اپنی صلاحیت' قوت' اوقات اور اپنی ذہانت و فطانت میں سے صرف اتنا حصہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے وقف کرے جو اُن کی بنیادی ضر[illegible]بات پوری کرنے کے

لئے لازم ہے، جسے آپ subsistence level کہتے ہیں، اور وہ بھی اس لئے کہ زندہ رہنا ہے تاکہ ہم کام جاری رکھ سکیں۔ زندگی برائے زندگی نہیں، زندگی بجائے خود مطلوب و مقصود نہیں ہے، مطلوب و مقصود تو اللہ ہے۔ **لا مقصودَ الا اللّٰہ** اور **لا مطلوبَ الا اللّٰہ**۔ لیکن زندگی کو برقرار رکھنا ہے کہ یہ اللہ کی عطا کردہ ایک نعمت ہے، اور اس لئے برقرار رکھنا ہے تاکہ اللہ کی راہ میں، اس کے دین کی اقامت اور سربلندی کے لئے، زمین پر اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کو بالفعل قائم کرنے کے لئے مسلسل محنت اور جدوجہد کی جا سکے۔ سائیں عبدالرزاق صاحب کا یہ قول میں متعدد بار بیان کر چکا ہوں کہ "جو دم غافل سو دم کافر"۔ یعنی جو وقت اللہ کی یاد سے غفلت میں بیت گیا وہ گویا حالتِ کفر میں گزر گیا۔ اسی طرح جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہے اسے جمع کرنا حقیقت کے اعتبار سے کفر اور ضلالت ہے۔ سورۃ الھمزۃ ابتدائی مکی دور کی سورت ہے۔ اس میں فرمایا گیا: ﴿**وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۞ الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۞ يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ۞**﴾ یعنی تباہی ہے، ہلاکت ہے، بربادی ہے، وَیل ہے ان لوگوں کے لئے جو ایک طرف اس اخلاقی پستی میں مبتلا ہیں کہ لوگوں کی عیب چینی اور عیب جوئی کرتے ہیں، طنز و طعن کا کام کرتے ہیں اور دوسری طرف مال جمع کرتے ہیں اور اسے گنتے رہتے ہیں، اپنی مالی حیثیت کا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ آج کی بیلنس شیٹ کیا ہے اور اس سال ہمارے اثاثوں (assets) میں کتنا اضافہ ہوا۔ ان کے دل کی کلی اسی سے کھلتی ہے۔ وہ یوں محسوس کرتے ہیں شاید اسی مال کی بدولت انہیں خلد اور دوام حاصل ہو جائے گا۔ ان تین آیات میں ایک پوری انسانی شخصیت کا ہیولیٰ اور ایک پوری ذہنیت کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے۔

مدنی قرآن میں انتہائی زمانے کی سورۃ التوبۃ کی آیات ۳۴، ۳۵ ملاحظہ کیجئے:

﴿**وَالَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَهَا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۞ يَّوۡمَ يُحۡمٰى عَلَيۡهَا فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكۡوٰى بِهَا جِبَاهُهُمۡ وَجُنُوۡبُهُمۡ وَظُهُوۡرُهُمۡ ؕ هٰذَا مَا كَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا كُنۡتُمۡ تَكۡنِزُوۡنَ ۞**﴾

یعنی جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر رہے‘ اے نبی انہیں بشارت دے دیجئے دردناک عذاب کی۔ (طنز کیا گیا ہے کہ انہیں بشارت دے دیجئے)۔ ایک دن آئے گا کہ یہی سونا چاندی جہنم کی دہکتی آگ میں تپا تپا کر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا‘ لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو!

تو مِمَّا میں مِنْ تبعیضیہ سمجھ کر آسانی سے نہیں گزر جانا چاہئے‘ بلکہ یہ بڑا فکر انگیز مقام ہے۔ ہاں‘ آدمی کی ضروریات کتنی ہیں‘ یہ معاملہ ہر شخص پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے لئے اس کا تعین خود کر لے۔ یہ اس کی اپنی assessment ہے۔ مختلف ذمہ داریوں کے ادا کرنے کے حوالے سے سب کی ضروریات برابر نہیں ہوتی۔ ایک چیز ایک شخص کے لئے luxury ہے‘ لیکن ہو سکتا ہے کہ دوسرے شخص کے لئے وہی چیز necessity ہو۔ اس اعتبار سے کوئی لگا بندھا ضابطہ نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ ہر شخص اپنا جائزہ لے لے کہ درحقیقت ان تمام چیزوں میں سے جو اللہ نے اسے عطا کی ہیں‘ اس قدر جتنا زندگی کے لئے‘ جسم اور جان کے تسلسل کو باقی رکھنے کے لئے اور اپنے اہل و عیال کے لئے ناگزیر ہے وہ تو اس کا صحیح اور جائز حق ہے‘ اس سے زائد جو کچھ ہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دے۔ جیسا کہ اقبال نے کہا تھا ؎

جو حرفِ قُلِ العَفو میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

واقعہ یہ ہے کہ دین کی بہت سی باتوں پر بہت گہرے اور دبیز پردے پڑ گئے ہیں۔ آپ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا وہ قول سن رکھا ہوگا کہ حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وِعَائَیْنِ ...... حضرت ابوہریرہؓ کا انتقال سن ۵۷ یا ۵۸‘ یا زیادہ سے زیادہ ۵۹ ہجری میں حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ حکومت میں ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی انقلابِ حال اس درجے ہو چکا تھا کہ فرماتے تھے:

حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وِعَائَیْنِ ' فَاَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ فِیْكُمْ ' وَاَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ (صحیح البخاری' کتاب العلم' باب حفظ العلم)

''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے (علم کے) دو برتن حاصل کئے تھے۔ ان میں سے ایک کو تو میں نے تمہارے مابین خوب عام کیا ہے' لیکن اگر دوسرے میں سے پھیلانا شروع کر دوں تو میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی''۔

اس درجے انقلاب اُس وقت آ چکا تھا اور لوگوں کی سوچ میں اس قدر تبدیلی آ چکی تھی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا ایک اور واقعہ بھی ہے کہ دِمشق کی جامع مسجد سے نکلے اور ناک صاف کرنے کی ضرورت پیش آئی تو رومی کتان' جو بہت قیمتی کپڑا ہوتا تھا' اس کا رومال نکالا اور ناک صاف کر کے پھینک دیا اور پھر خود ہی کہنے لگے: اے ابو ہریرہ! آج تمہارا حال یہ ہے' اور وہ دن بھی تھے جب تم پر فاقوں کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ شاید مرگی کا دورہ پڑا ہے' تو پاؤں رکھ کر تمہاری گردن دباتے تھے۔ اصحابِ صُفّہ کا دَور عسرت اور تنگ دستی کا دَور تھا۔ بعد میں فتوحات کے نتیجے میں دولت کی ریل پیل ہو گئی۔ ظاہر بات ہے کہ جب اس طور سے دنیا عام ہوئی تو پھر لوگوں کے اندازِ فکر میں بھی تبدیلی آ گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ((لَا الْفَقْرُ اَخْشٰی عَلَیْكُمْ......)) ''اے مسلمانو! مجھے تم پر فقر اور احتیاج کا کوئی خوف نہیں ہے (فقر اور احتیاج میں تو اللہ یاد آتا ہے' اللہ کی طرف رجوع ہوتا ہے۔) مجھے اندیشہ ہے تو اس کا کہ دنیا کے خزانے تمہارے پاؤں میں آئیں گے اور پھر تم اس دنیا کی وجہ سے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹو گے''۔

ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خدا است

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ ؕ ﴾ ''اور انفاق کرو اس میں سے جس پر اللہ نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے''۔ یہ الفاظ اس اعتبار سے بھی فکر انگیز ہیں کہ ان میں ہماری حیثیت معین کی گئی ہے۔ پہلے تو فرمایا کہ تمہیں خلافت دی گئی ہے' اپنے آپ کو مالک نہ سمجھ بیٹھنا۔ نہ تم مَلِک ہو نہ مالِک ہو' مالک حقیقی بھی اللہ اور مَلکِ حقیقی بھی وہی

ہے۔ تمہیں تو خلافت دی گئی ہے' تم نائب ہو' تم custodian ہو' تم امین ہو' تم اللہ کے حکم کی تنفیذ کرنے والے ہو۔ یہ مفہوم لفظ ''استخلاف'' میں پنہاں ہے۔ پھر یہاں اسم مفعول کا صیغہ ''مُسْتَخْلَف'' آیا' کہ یہ خلافت بھی تم نے خود حاصل نہیں کی ہے' بلکہ اللہ نے تمہیں عطا کی ہے۔ مزید یہ کہ ﴿ مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾ میں ''مُسْتَخْلَفِيْنَ'' مفعول بہٖ بن کر آیا ہے' یعنی تم مجعول ہو۔ درحقیقت تمہاری تو کوئی حیثیت ہے ہی نہیں' اس نے تمہیں بنایا ہے خلافت دیے ہوئے (مُسْتَخْلَفِيْنَ) اُن چیزوں میں جو کہ اس نے تمہیں دی ہیں۔ ان میں تمہارا جسم ہے' تمہاری توانائی ہے' تمہاری ذہانت و فطانت ہے' تمہاری دُور بینی اور دُور اندیشی ہے' تمہارا وقت ہے' تمہاری صحت ہے' تمہاری قوتِ کار ہے' تمہاری عمر ہے' خاص طور پر تمہاری جوانی کی عمر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے حضور ابنِ آدم کے قدم اُس وقت تک اپنی جگہ سے ہل نہیں سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کر لی جائے:

> عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ؟ وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ؟ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيْمَ اَنْفَقَهُ؟ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ؟ (سنن الترمذی' فی صفة القیامة' باب ۱)
>
> ''(۱) اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں گنوائی؟ (۲) اس کی جوانی کے بارے میں کہ کہاں لٹائی؟ (۳) اس کے مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا؟ (۴) اور کہاں خرچ کیا؟ (۵) اور جو علم حاصل کیا اس پر کتنا کچھ عمل کیا؟''

دیکھئے عمر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کے بارے میں دو سوال ہیں۔ ''جو عمر ہم نے تمہیں دی تھی وہ کہاں گنوائی؟ اور خاص طور پر جوانی کہاں لگائی؟'' معلوم ہوا کہ یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو اللہ نے ہمیں دی ہیں اور اُس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان سب چیزوں میں سے اس کی راہ میں انفاق کریں۔ اس آیت پر ابھی مزید گفتگو اگلی نشست میں جاری رہے گی۔

بارك الله لی ولكم فی القرآن العظيم ونفعنی وإياكم بالآيات والذكر الحكيم